میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔ ''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کئے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام دیا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست برہم سروپ خارمیرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا۔ تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی دربارداری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کردیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تناؤ کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ و ثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ کراچی میں چند مہینے قیام کر کے وہ لاہور گئے پھر کراچی آتے جاتے رہے۔ نجم صاحب محافل شعروسخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں اور مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب،

شاعر اور خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یادداشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : 9½ بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میّت : وصیّت کے مطابق مکان پر ہوا

نمازِ میت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : شیخ حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبر آبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخِ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراقِ نجم آفندی مرحوم
"غروب انجم نجم" اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیضؔ بھرت پوری:

رحلت شاعرِ فنا فی اللہ
حجمؔ آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحرؔ لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
حجمؔ ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسرؔ منہاس:

دُریک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعرِ نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیسانؔ اکبرآبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغلِ سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلشؔ پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلش اب تو یوں
ہے لکھا غم حجمؔ دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقرؔ امانت خوانی:

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے حجمؔ ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق بہ تجمل — شاعرِ اہل بیت جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم — نجم گئے ہیں باغِ جناں میں

1395ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مرجع کرم خسروِ قلیمِ دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازش ملّت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحیدِ زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے — نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت — بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395ہجری

تعداد کل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علاّمہ نجمؔ آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209 بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
کل اشعار = (12799)			

جناب امیر امام حُر

نجم آفندی کی ہندی شاعری

جناب نجم آفندی سے مجھے پہلی بار شرف زیارت جب حاصل ہوا جب وہ لکھنؤ کے 1939ء والے شیعہ ایجی ٹیشن کے بعد جیل سے نکل کر آئے اور بجائے حیدرآباد دکن واپس جانے کے لکھنؤ ہی میں قیام کو ترجیح دی۔ میرے خالو صاحب، جناب سید حسن مہدی (برادر جناب سید محمد مہدی، رابطہ صاحب پیر پور) سے جناب نجم آفندی کی ملاقات اور تعارف غالباً جیل میں ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے موصوف سے گزارش فرمائی کہ ان کے بڑے بیٹے، سید حسین مہدی سلمہ کو اردو اور فارسی کی تعلیم اور ادبی تعلیم دے دیں۔ اس سلسلے میں جناب نجم آفندی کا قیام محمود آباد ہاؤس، قیصر باغ میں تقریباً دو سال رہا، جس کے بعد وہ پھر حیدرآباد دکن واپس چلے گئے۔

اس دو سال کی قلیل مدت میں میں نے جناب نجم آفندی کو کافی قریب سے دیکھا۔ البتہ اس زمانے میں میری عمر اتنی نہ تھی کہ موصوف کی ادبی شخصیت کی پوری معرفت حاصل کرتا۔ (میری ولادت جنوری 1928ء کی ہے اور میں اس دوران میں لڑکپن اور نوجوانی کے درمیان میں تھا) لیکن نجم آفندی کی ادبی و شعری شخصیت سے بغیر تھوڑا بہت متاثر ہوئے، شاید ہی کوئی اس زمانے میں رہا ہو۔

جناب سید آلِ رضا صاحب دام مجدہٗ، جناب جوشؔ اور جناب نجمؔ، یہ تینوں حضرات اس زمانے میں مرثیہ سرائی شہدائے کربلا کو اپنے اپنے مخصوص و منفرد انداز میں ایک نیا رنگ دے رہے تھے۔

انیسؔ و دبیرؔ، و عشقؔ و تعشقؔ و اوجؔ و نفیسؔ کے زمانے سے لے کر ان تینوں حضرات یعنی سید آلِ رضاؔ، جوشؔ اور نجمؔ آفندی کے عہد تک جو فکری و ادبی تغیرات تمام دنیا میں اور برصغیر میں واقع ہو چکے تھے اس سے کوئی سماج اور مجمع بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا تھا۔ ہمارے زمانے تک وہ

سابق اودھ کا افق پھیل کر عالمی بن چکا تھا۔ انگریزی تعلیم، انگریزی اردو، عربی اور فارسی زبانوں کی کتابوں کی طبع ونشر و اشاعت، اخباروں اور پھر ریڈیو کی خبروں کے ذریعے سے دنیا بھر کی اطلاعات اور معلومات وغیرہ، ان سب کا لازمی نتیجہ ہمارے اذہان کے آفاق کی غیر متوقع توسیع تھی اور اب ہم سب ہی اس کے قبل والی ذہنیتوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے، لیکن ایک تخلیقی ذہن اور ادبی صلاحیت والی شخصیت میں اور ہم سب کے ذہن اور صلاحیت میں یہی فرق ہوتا ہے کہ چاہے احساس کم وبیش ہم سب کو ہو، لیکن قیادت وہی کرتے ہیں جن میں غیر معمولی تخلیقی استعداد ہوتی ہے۔

چنانچہ مرثیہ سرائی شہدائے کربلا میں جن حضرات نے ہمارے عہد میں اس تخلیقی کام اور ادبی قیادت کو پورا کیا، ان میں ان تینوں حضرات یعنی سید آل رضاؔ، جوشؔ اور نجمؔ آفندی کو شاید اولیت حاصل ہے۔

جناب نجمؔ کی مرثیہ سرائی، سید آل رضاؔ اور جوشؔ دونوں حضرات سے مختلف انداز رکھتی ہے۔ جوشؔ کی مرثیہ سرائی ان کی انقلابی شاعری اور ان کی آزاد فکری کی ایک تحدید ہے۔

سید آل رضاؔ کی مرثیہ سرائی اور نجمؔ آفندی کی مرثیہ سرائی اس بات میں مشترک نظر آتی ہے کہ دونوں کے یہاں بے انتہا خلوص وعقیدت کا گہرا احساس ہوتا ہے، لیکن جہاں سید آل رضا کے مراثی میں لکھنؤ کی زبان کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ نئے خیالات و افکار کی تازگی ہے، وہاں نجمؔ آفندی کی مرثیہ سرائی میں ہندی زبان کے ادب کے اثرات اور ہندوستان کی دنیا کی انفرادیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میرا ذاتی تاثر پورے طور پر معروضی نہ ہو، لیکن مجھے ہمیشہ نجمؔ آفندی کی ہندی زبان میں مرثیہ سرائی، ان کی اردو زبان کی مرثیہ سرائی سے زیادہ موثر محسوس ہوئی۔

کم از کم امیر خسروؔ کے عہد سے لے کر اب تک جو ہندی ادب مسلمانوں کے دوران حکومت میں اور پھر انگریزی حکومت اور آزادی برصغیر کے عہد میں وجود میں آیا ہے، وہ خود بہت وسیع اور متنوع ہے۔ کبیر داس کے دوہوں سے لے کر حالی جی (جمیل الدین حالیؔ) کے دوہوں تک جو ہندی ادب ہمارے سامنے ہے، وہ کسی طرح اردو ادب سے کم ادبی اہمیت نہیں رکھتا۔ آرزوؔ لکھنوی کی خالص اردو اسی ہندی ادب اور اردو ادب کے درمیان ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہی نہیں

ہے، بلکہ ایک بہت شگفتہ ادبی تخلیق ہے۔ آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' جو خالص اردو میں نظموں کا گلدستہ ہے، اپنی شیرینی زبان اور لطافتِ احساس میں آپ اپنا جواب ہے۔ اس میں دو نظمیں قابل توجہ ہیں جو ایک ہی زمین میں تو ہیں لیکن ایک عاشقانہ غزل ہے اور دوسری رثائی نظم ہے۔ قافیہ برسا، ٹھہرا، وغیرہ اور ردیف پانی۔ اور اس مشکل زمین میں اور برخود غائد کردہ خالص اردو کی قید کے باوجود، یہ دونوں بے تکلف انداز اور برجستگی و بیساختگی میں آمد کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہیں۔

نجم آفندی نے ہندی زبان میں جو مرثیہ سرائی کی ہے وہ بھی اسی طرح آمد میں آپ اپنی مثال ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ہندی زبان کی مرثیہ سرائی میں ان کی خلوصِ عقیدت اور بھی زیادہ اس لیے واضح نظر آتی ہے، چونکہ ہندی زبان کی سادگی اور بیساختگی نجم آفندی کی شاعری کی اس خصوصیت کو اور بھی زیادہ اجاگر کر دیتی ہے۔ اس کا دوسرا سبب شاید یہ بھی ہو کہ نجم آفندی کی مرثیہ سرائی کا جو مقصد تھا وہ بلیغ تھا اور اردو سے زیادہ یہ مقصد ہندی کے ذریعے حاصل ہوتا تھا۔ ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب دنیا بھر حسین ابنِ علی اور ان کے رفقاء کی شہادت کے پیغام اور مقصد کو سمجھ کر دکھ اور درد کی دنیا سے پوری طرح ہمدردی کا احساس کرنے لگے گی۔ لیکن ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اور برصغیر کے ایک باشندے ہوتے ہوئے نجم آفندی کو شاید یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ ان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثریت کو اسلام کی اس دکھ بھری کہانی، یعنی واقعہ کربلا سے آگاہ کریں اور اس مقصد کے لیے ہندی زبان سے زیادہ کوئی اور زبان مناسب نہ تھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ جیسا مجھے ذاتی طور پر محسوس ہوتا ہے، نجم آفندی کی ہندی زبان کی مرثیہ سرائی، ان کی اردو زبان کی مرثیہ سرائی سے بھی زیادہ مؤثر ہے۔

نجم آفندی کی اس فکر و نظر کا ثبوت ان کی ایک نثری تصنیف سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے بعنوان ''حسین اور ہندوستان'' اس موضوع پر لکھی ہے کہ جناب سید الشہداء کا ایک ارادہ یہ بھی تھا کہ اگر انھیں تبلیغ اسلام کے لیے ہندوستان جا کر اخلاق حسنہ سے اسلام کی دعوت دینا ہو تو انھیں جانے کا موقع دیا جائے۔

نجم آفندی کی ہندی زبان کی مرثیہ سرائی کی جو مثالیں اس وقت تک میری نظر سے گزری ہیں ان میں من جملہ ''اسلام پوتھی'' ''کربل نگری'' کے، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ جو کچھ ماقبل

کی سطروں میں کہا گیا ہے، غلط نہیں ہے۔ ''دکھ کا ساگر'' ''کھیون ہار'' ''حسینیٔ سیوا'' ''پریم پنتھی'' اور ''دھرم پربت'' بھی ہیں۔ اول الذکر نسبتاً طویل ہیں لیکن آخر الذکر بہت درد بھری اور موثر ہیں۔ ان میں سے چند اشعار کا اقتباس بطور مثال اور بغرض شواہد، قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ آیا جو کچھ اوپر کی سطروں میں عرض کیا گیا ہے، وہ درست ہے یا نہیں۔

کربل بن سے چلے مسافر باجت کوچ نقارا — ایک اک سیس انی پر چمکے چمکے جیسے تارا
سب سے لانبی پرچھی پردہ سیس حسینؑ سوامی کا — بھرے پُرے سنسار میں جس کو بھوکا پیاسا مارا
پریم کی نیا ڈوب رہی تھی کیسی پار لگائی — اپنے لہو میں ڈوب کنارے لایا کھیون ہارا
جان گئے پردیسی دیسی جھوٹی سانچی مہما کو — ہار ہے کس کی جیت ہے کس کی مان گیو جگ سارا
ہنس ہنس دکھ کی کڑیاں جھیلیں جگ کو یہ اُپدیش دیا — اپنے دم کا آس بھروسہ مالک نام سہارا
نگری نگری دھوم مچی ہے واہ حُسینؑ بابا کی — کربل بن میں دیا جلایو سارا جگت اجیارا

(کھیون ہار)

اندھیارا پاپ کے بادل کا سنسار پہ جب چھاجاتا ہے
اک چاند سروپی سورج روپی مکھڑا درس دکھاتا ہے
جب مایا جگ کو کھاتی ہے جب ایسی بپتا آتی ہے
جب مالک آنکھ بدلتے ہیں اک بندہ آڑے آتا ہے
اک جینا مرنا اُن کا ہے جو جیتے ہیں مرجاتے ہیں
اک جینا مرنا اُس کا ہے جو مر کے امر ہوجاتا ہے
جاگی ہوئی کب کی آنکھیں تھیں خنجر کے تلے بھی آہ نہ کی
سکھ نیند اُسی کو آتی ہے جو سوتی قوم جگاتا ہے
بھاشا کے رسیلے شبدوں میں دکھ روپ کہانی کربل کی
محنت یہ سوارت ہو بھگتی یوں کون کسے سمجھاتا ہے

(دھرم پربت)

شبیر کے تن کی بستی میں شبیرؑ کا من کیا ہیرا تھا
اس دیپ کی لَو بڑھتی ہی رہی آنکھوں میں اندھیرا چھائے گیا
سنتے ہیں کہ دھرتی کانپ گئی تلوار وہ کی تلوار یئے نے
جو بھور سے لے کر سانجھ تلک لاشیں ہی اٹھا کر برسائے گیا
کیا تیروں کی بوچھاروں میں اُپدیش کی میٹھی باتیں تھیں
سب اپنے لہو کے پیاسوں پر وہ امرت بیل برسائے گیا
سنسار کو ست کی شکتی سے گھر بار لٹا کر موہ لیا
سودا ہے ذرا اک جوکھم کا جو کھوئے گیا وہ پائے گیا
اب جا کے ہمالہ پربت سے لَے ماتم کی ٹکراتی ہے
اس دیس کی نجمی دور بلا جس دیس پہ یہ غم چھائے گیا

(پریم پنتھی)

جی دے کے یہ سورگباش ہوئے کو نے کے ادھرمی ناش ہوئے
شبیرؑ کا بول بالا رہا اسلام کی اونچی بات رہی
سانچے ہی رہے جو سانچے تھے یاں سانچ کو کوئی آنچ نہیں
دشمن ہی کو سب نے دوش دیا اور ان کے لیے صوات رہی
ایشر کی دیا لہرائے گی آکاش کی بانی آئے گی
دکھ درد کی جتنی دھوپ بڑھی سنتوش کی بدلی چھات رہی
اب راجا پرجا چوکھٹ پر سب سیس نوائے بیٹھے ہیں
جب چھوڑ کے دنیا دین لیا دنیا بھی انھیں کے ہات رہی
جب آئے حسینی سیوا میں سب ہندو مسلم ایک ہوئے
مل جائیں گے جمی دل بھی کبھی جب اُن کی نجر پر بات رہی

(حسینی سیوا)

سنسار کا چاہا اُس نے بھلا کٹوادیا کنبے بھر کا گلا
شیرؔ کے من کے سانچے میں کرتار نے بھگتی ڈالی تھی
مارے گئے ست کی سیوا میں دھنباد ہے ایشر بھگتوں کو
مکھڑوں پہ لہو کی لالی سے بڑھ بڑھ کے خوشی کی لالی تھی
یہ جی سے گزرنے والے تھے یہ بات پہ مرنے والے تھے
کب موت سے ڈرنے والے تھے سو بار کی دیکھی بھالی تھی

(دکھ کا ساگر)

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ ہندی زبان میں تجم آفندی نے بڑی غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ان باتوں کو کہا ہے جو ہم شاید اردو ہی میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور ان کی اس کامیابی میں ان کے اِس خلوص کا بڑا حصہ ہے جو ان کا تبلیغی مقصد تھا یعنی حسینؑ پیغام اور اسلامی اصول کو آفاقی و عالمی ثابت کر کے اُس کی طرف دعوت دینا۔ لیکن جس طرح ہر اچھی بات پہلے اپنے نزدیک ترین لوگوں سے کہی جاتی ہے اور اس کا ثبوت خود اسلام کی تاریخ کے اس اہم واقعے یعنی دعوت عشیرہ سے ملتا ہے، اسی طرح تجم آفندی نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنے وطن یعنی ہندوستان کی اکثریت کو مخاطب کر کے حقیقی اسلام کے اصول کو ان کے لیے اجاگر کریں اور اس کے لیے دو باتیں ضروری تھیں، ایک تو واقعات و امور دین سے سب سے اہم واقعے کا انتخاب، جو ان کی نظر میں واقعۂ کربلا ثابت ہوا اور دوسرے زبان کا انتخاب، جو ظاہر ہے کہ اکثریت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندی زبان ہی مناسب تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تجم آفندی نے اپنے ان فیصلوں میں بڑی بصیرت سے کام لیا اور ہمیں ان کی اس بصیرت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی خوبیوں کا قائل ہونا پڑے گا۔''

○

نجمؔ آفندی
کا
ہندی کلام

.1	کربل نگری	(115) اشعار
.2	اسلام پوتھی	(158) اشعار
.3	جگت گرو	(9) اشعار
.4	کھیون ہارا	(12) اشعار
.5	دکھ کا ساگر	(11) اشعار
.6	پریم پنتھی	(11) اشعار
.7	دھرم پربت	(14) اشعار
.8	حسینیؑ سیوا	(11) اشعار
.9	پریم کہانی	(11) اشعار
.10	ست کی سیوا	(16) اشعار
.11	ست جگ کا ستارہ	(26) اشعار
.12	درشن کا اُجالا	(12) اشعار
.13	قیدی کا راگ	(6) اشعار
.14	کوچ کا ڈنکا باجت ہے	(7) اشعار
.15	آؤ سہیلی جیل چلیں	(8) اشعار
.16	پنتھ نارا کے دن	(7) اشعار
.17	حسینیؑ درشن	(12) اشعار
.18	پردیسی	(12) اشعار

کربل نگری

سن ساٹھ تھا سنسار میں ڈالے ہوئے ڈیرا
چھایا ہوا تھا پاپ کے بادل کا اندھیرا

بھولا ہوا تھا پالنے والے کو زمانہ
دھرتی پہ غریبوں کا نہ تھا کوئی ٹھکانہ

اسلام تھا اِک خون میں ڈوبا ہوا لاشہ
روزوں کی ہنسی تھی تو نمازوں کا تماشہ

شیطان کے بندوں نے مٹا رکھا تھا اسلام
تلوار کی شکتی کو بنا رکھا تھا اسلام

سُکھ روگ کی اگنی میں تھیں دہکی ہوئی نظریں
مایا کے چمتکار سے بہکی ہوئی نظریں

ہر بات بناوٹ تھی تو ہر کام میں تھا کھوٹ
سونے کی ملاوٹ سے تھا جیون میں نرا کھوٹ

اَنیائے کا تھا راج تو اپرادھ کی جے تھی
قرآن کے اُپدیش کی بدلی ہوئی لَے تھی

چھوڑے ہوئے ستّ دھرم کی چاہت کو یزیدی
سنگوائے ہوئے بیٹھے تھے دولت کو یزیدی

عزت کا غریبوں کے لیے کال پڑا تھا
مایا کا جو مالک تھا وہی سب میں بڑا تھا

دنیا کے مزے ظالمِ شامی کے لیے تھے
کمزور، امیروں کی غلامی کے لیے تھے

ہاتھوں میں نہ کس بل تھا نہ تھی خون میں گرمی
دس بیس جو دھرمی تھے ہزاروں تھے ادھرمی

کہلاتی تھی اچھی وہی، جو بات بُری تھی
اچھائی کی گردن میں حکومت کی چھُری تھی

بے رحم نگاہیں یہ مزے لوٹ رہی تھیں
مزدور کے سینے کی رگیں ٹوٹ رہی تھیں

لائی تھیں مہا پاپ کی برسات شرابیں
پانی کی طرح اُڑتی تھیں دن رات شرابیں

سنسار نظر آیا جو اُپدیش کا پیاسا
کوفہ کو چلا گھر سے محمدؐ کا نواسا

لچھا تھی کہ گرتی ہوئی دیوار سنبھالے
اللہ کے بندوں کو بُرائی سے بچالے

تلوار نہ رستہ میں اُٹھائی تھی کسی پر
لڑنے کا نہ ساماں نہ چڑھائی تھی کسی پر

لپٹے تھے وہ چرنوں سے جو تھے چاہنے والے
کچھ ساتھ کے کھیلے ہوئے، کچھ گود کے پالے

ساتھی بھی وہ پائے جو رِشی اور مُنی تھے
بچے بھی تو اس گھر کے گیانی تھے گُنی تھے

بھارت کے بَسیّا نہ اُنہیں ہاتھ سے کھوتے
کہلاتے وہ اوتار جو اس دیش میں ہوتے

شبیرؑ کے قبضہ میں تھا لشکر نہ ریاست
سچائی کی پونجی تھی اور اولاد کی دولت

کرتار کی مایا تھی نہ اپنی نہ پرائی
بیٹا تھا برابر کا برابر کا تھا بھائی

مائی کی کمائی تھی بہن کے تھے دُلارے
دھرتی میں چمکتے ہوئے آکاش کے تارے

سب چھوٹے بڑے مل کے تھے گنتی میں بہتّر
اتنے ابھی کم سِن تھے کہ جھولے میں تھے اصغرؑ

اٹھارہ برس والے تھے نانا کی نشانی
تھی روپ میں اکبرؑ کے پیمبرؐ کی جوانی

سب کہتے تھے ماں باپ کے سائے میں بڑھیں گے
کنبہ کو یہ آشا تھی کہ پروان چڑھیں گے

پردہ میں تھیں کچھ بی بیاں چہروں کو چھپائے
سہمے ہوئے بچوں کو کلیجہ سے لگائے

یثرب سے نکل کر کہیں آرام نہ پایا
رستہ وہ کٹھن جس میں نہ پانی تھا نہ سایا

وہ دھوپ کڑی اور وہ گرمی کا مہینہ
بہتا ہوا وہ چاند سے ماتھوں سے پسینہ

مُرجھائے ہوئے دھوپ میں تھے، پھول سے چہرے
سنولائے ہوئے روپ میں تھے، پھول سے چہرے

کوفہ بھی نہ پہنچے تھے ابھی سیدِ والا
رستہ میں ملا شام کے حاکم کا رسالہ

تھی شہر میں شبیرؑ کے جانے کی مناہی
ناکہ پہ تھے ایک ہزار ایک سپاہی

آپے میں مگر کوئی نہ چھوٹا نہ بڑا تھا
اک ایک جواں موت کے چکر میں پڑا تھا

تپتا تھی کڑی دن کو نظر آتے تھے تارے
جنگل میں پڑے پھرتے تھے سب پیاس کے مارے

جانے کو تھیں پانی کے لیے ہاتھ سے جانیں
گھبرا کے نکل آئی تھیں ہونٹوں پہ زبانیں

سردار بھی، لشکر بھی تھا جینے سے نراسا
رحم آگیا سیدؑ کو انہیں دیکھ کے پیاسا

پُن کر کے بھی شرمائے جو داتا ہو تو ایسا
دشمن پہ ترس کھائے جو داتا ہو تو ایسا

ہونٹ اس کے ہلے کھل گئے مشکوں کے دہانے
اِک آن میں سب اُٹ گئے پانی کے خزانے

برکھا کی جھڑی بن کے برستا رہا پانی
سوکھے ہوئے جنگل کی زمیں ہوگئی دھانی

کیا دل تھا کہ اپنے لیے قطرہ نہ بچایا
سب پی چکے جب گھوڑوں کو اونٹوں کو پلایا

جب پیاس بجھی بھول گئے موت کا آنا
گن ایک نے بھی جان بچانے کا نہ مانا

جان آ گئی دیہی میں یہ دو گھونٹ جو پی کے
پہنچا دیا مقتل میں نواسۂ کو نبیؐ کے

پردیس میں دھوکے سے بُلا کر اُسے مارا
احسان کا یوں بھی کوئی کرتا ہے اُتارا

جلتی ہوئی ریتی پہ بسے پیاس کے مارے
خیمے بھی نہ رہنے دیے ندی کے کنارے

سب گھاٹ کو روکے ہوئے بے شرم کھڑے تھے
تپتے ہوئے میدان میں مہمان پڑے تھے

پھر فوج پہ فوج آنے لگی شام نگر سے
بصرہ سے کبھی اور کبھی کوفے کی ڈگر سے

ایسی ہوئی جنگل میں ستم گاروں کی بھرتی
تلواروں کی جھنکار سے ہلنے لگی دھرتی

بھر مارتھی کوفہ سے یہ کربل کی زمیں تک
چالیس ہزار آئے محرم کی نویں تک

بھر پور تھے اَن جَل سے اُدھر دشمنِ جانی
یاں ساتویں تاریخ سے کھانا تھا نہ پانی

حاکم کا سندیسہ تھا کہ مرنے کی نہ ٹھانو
جان اپنی ہے پیاری تو حکومت مری مانو

سو طرح کی تکلیف تھی سو پھیر پڑے تھے
پر بات پر اپنی یہ جواں مرد اڑے تھے

ساونتوں نے کس ٹھاٹھ سے یہ رات گزاری
سب موت کی سیوا میں رہے ستَ کے پُجاری

ایک ایک کو تھی فکر کہ ہتھیار سنواریں
دیکھی گئیں پرکھی گئیں تلواروں کی دھاریں

سب کرتے تھے ستَ دھرم پہ مرنے کی دعائیں
بچوں کو اُدھر خیمہ میں سمجھاتی تھیں مائیں

دیکھو کہیں میدان میں عزت نہ گنوانا
دو جگ کو رہے یاد وہ تلوار چلانا

دسویں کی ہوئی صبح تو دولہا سا بناکر
بھیجا انہیں ماں بہنوں نے ہتھیار سجا کر

کیا دیکھنے کا ذکر ہے سننے میں نہ آئی
چالیس ہزار اور بہتّر کی لڑائی

مولا کا سپاہی نہ بڑھا تھا کوئی صف سے
تیر آئے پہل ہوگئی دشمن کی طرف سے

شبیرؑ نے پھر بڑھ کے یہ اُپدیش سُنایا
تم نے مجھے خط لکھ کے ہے مہمان بُلایا

گردن پہ نہ لو خون یہ سودا نہیں سستا
میں ہند چلا جاؤں گا دیدو مجھے رستا

اُس فوج کے افسر نے سُنی جب کہ یہ بانی
رستہ میں جسے آپ نے پلوایا تھا پانی

شرما گیا کرنی پہ کہ ہر دے میں دَیا تھی
مرنے کے لیے ہوگیا شبیرؑ کا ساتھی

اک بیٹا تھا، اک بھائی تھا اور ایک تھا چاکر
سب ساتھ ہوئے پریم ڈگر سامنے پاکر

اُس فوج سے اللہ کے پیارے نکل آئے
بادل کو ہٹاکر یہ ستارے نکل آئے

سو روک پہ بے کام کئے رہ نہیں سکتی
سنسار سے کہہ دو کہ یہی ست کی ہے شکتی

سونے کی طرح ست کی کسوٹی پہ کھرے تھے
پہلے یہی رَن ویر جواں لڑ کے مرے تھے

جب ٹھن گئی ایک ایک بھی دو دو بھی سدھارے
ایک ایک نے سو سو کو کیا گور کنارے

کم سن تھے جو بچے وہ بہت رن میں اڑے ہیں
دن کھیلنے کے جن کے تھے کیا کیا وہ لڑے ہیں

جس ماں کا گیا لال وہ دروازے پر آئی
لکھا ہے کہ خود پردے سے دیکھی ہے لڑائی

سنتے چلے آئے ہیں کہ ایسا بھی تھا کوئی
شبیرؑ کے انصار میں دولہا بھی تھا کوئی

اِس عمر میں یوں موت بھلا کس نے ہے چاہی
سو سال کے بوڑھے بھی تھے آقا کے سپاہی

وقت آتے ہی ہونے لگیں بپتا میں نمازیں
پڑھنے لگے سب تیروں کی برکھا میں نمازیں

سینوں کو سپر کردیا ہر تیر کے آگے
دو ویر کھڑے ہوگئے شبیرؑ کے آگے

اِک مرگیا اُن میں کا مگر منہ کو نہ موڑا
دم توڑ دیا پریم کے بندھن کو نہ توڑا

عباسؑ سا اب ایک بھی شیدائی نہ ہوگا
سوتیلا تھا ایسا کہ سگا بھائی نہ ہوگا

کانپی ہے زمیں نہر کی رن ایسا پڑا ہے
جب گھاٹ پہ مشک اور عَلَم لے کے لڑا ہے

سرکائے تو اِس ڈھب سے کوئی فوج کا ریلا
دریا کوئی چھینے تو ہزاروں سے اکیلا

دریا پہ جو پیاسا کوئی رہ جائے تو مانیں
پانی نہ پئے پیاس میں دو دن کی تو جانیں

پانی کو وفادار نے منہ بھی نہ لگایا
بچوں کے لیے مشک بھری اور پلٹ آیا

پھر فوج سمٹ آئی علم دار کو گھیرا
تیر اتنے چلے چھاگیا جنگل میں اندھیرا

آس اُس نے نہ دی ہاتھ سے ہاتھوں کو کٹا کر
ساونت بڑھا مشک کو دانتوں میں دبا کر

نکلا ہے کبھی اور کبھی فوجوں میں گھرا ہے
جب تیر پڑا مشک پہ گھوڑے سے گرا ہے

اکبرؑ کا وہ روپ اور وہ مر جانے کا ارماں
خیمہ سے نکل آیا تھا جنگل میں چندر ماں

کِس شوق سے ماں باپ نے دیکھی ہے لڑائی
بابا نے جواں بیٹے کی خود لاش اٹھائی

کیا دُکھ سے بھری ہے علی اصغرؑ کی کہانی
دو دن سے ملا تھا نہ جسے دودھ نہ پانی

شبیرؑ نے خیمہ سے اُسے گود میں لاکر
سب فوج کو دکھلا دیا ہاتھوں پہ اُٹھا کر

کارن تھا کہ شاید کوئی جان اس کی بچا دے
دو بوند سسکتے ہوئے بچے کو پلا دے

سب نے کیے مرجھائے ہوئے پھول کے درشن
سنتے ہیں کہ منہ پھیر کے رونے لگے دشمن

پانی کی دیا ایک کے دل میں بھی نہ آئی
اک تیر سے بچے کی ہوئی دودھ بڑھائی

دم توڑ دیا باپ کے ہاتھوں پہ اُچھل کر
سنسار سے پیاسا ہی گیا خون اُگل کر

ایسا کبھی اپرادھ نہ دنیا میں ہوا تھا
دیکھا تھا نہ آنکھوں نے نہ کانوں نے سنا تھا

بچہ کی یہ سج دھج تھی یہ سُمرن تھی پتا کی
اتنا ہی کہا منہ سے جو مرضی ہو خدا کی

اب لڑنے کے قابل کوئی چھوٹا نہ بڑا تھا
اِک چاند تھا بیمار جو خیمہ میں پڑا تھا

نِردوش کو ناچار کو پایا جو اکیلا
کھینچے ہوئے تلواریں بڑھا فوج کا ریلا

اب شیر نے انگڑائی لی اور باگ سنبھالی
بجلی سی چمکتی ہوئی تلوار نکالی

سر سینکڑوں ہر وار میں تلوار نے رولے
برکھا ہوئی لوہو کی برسنے لگے اولے

زخمی نے مسافر نے زمیں رن کی بلادی
پیاسے نے بڑی دور تلک فوج بھگادی

وقت آیا شہادت کا تو بے خوف ٹھہر کر
سجدے میں جھکا خاک پہ گھوڑے سے اُتر کر

بادل کی طرح چھاگئے بھاگے ہوئے مکار
بیکس پہ برسنے لگی تلوار پہ تلوار

مجبور اُسے دیکھ کے بے بس اُسے پاکے
سرکاٹ لیا شمر نے سجدہ میں خدا کے

پھر لوٹ پڑی آگ لگائی گئی گھر میں
آکاش تلے یوں نہ کُھلا کوئی سفر میں

کچھ بی بیاں، بچے کئی نازوں کے پلے تھے
سب ایک ہی رسی میں غریبوں کے گلے تھے

باندھا گیا اک اونٹ پہ بستر سے اٹھاکر
بیمار کو بھی لے گئے زنجیر پنہا کر

غم ہے اُسی مظلوم کا ماتم ہے اُسی کا
تیرہ سو برس سے یہ محرم ہے اُسی کا

شبیرؑ نے اس دیس کو جب یاد کیا تھا
اسلام کا بھارت میں پتہ تھا نہ سرا تھا

کوئی تو ہے اس دیس سے مظلوم کا بندھن
کیوں ورنِ حسینی ہے یہ دت قوم کا بامن

کچھ بھید ہے جو سوگ میں جوگی سے بنے ہیں
ہندو اِسی دھرتی پہ عزادار گھنے ہیں

اب تک جو ہیں انجان کچھ ایسے بھی ہیں بھائی
ہو جاتی ہے مظلوم کے ماتم پہ لڑائی

بھول اپنی ہے ہردے میں جو یہ گرد جمی ہے
دوش ان کا نہیں اپنی ہی کوشش میں کمی ہے

جو حال سنانا تھا سنایا نہیں ان کو
مہماں کا جنازہ ہے بتایا نہیں ان کو

بھارت کے پچھوتو اور اچھوتو اِدھر آؤ — مہمان کے تابوت کو سب مل کے اُٹھاؤ
خود اس نے کیا تھا اِدھر آنے کا اشارا — مہماں جو ہمارا ہے وہ پہلے ہے تمہارا
ہر سال وہ آتا ہے محبت کو بڑھانے — آپس میں گلے ہندو و مسلم کو ملانے
مہمان کا یوں کرتے ہیں آدریہ دکھاؤ — شبیرؑ کی جے بول کے دنیا کو بلا دو

پھر سے خون مسلماں کا نہ ہندو کا بہے گا
شبیرؑ کے صدقے میں سدا میل رہے گا

اسلام پوتھی

اللہ بنادے اِسے آکاش کی بانی — کہنی مجھے بھاشا میں ہے اسلام کہانی
لکھی نہ گئی کوئی جو اِس طرح کی پُستک — اسلام کو سمجھے نہیں اِس دیش کے سیوک
چرچے ہیں کہ پھیلا ہے یہ تلوار کے بل پر — استھان ہے بے نیو کی دیوار کے بل پر
سب ڈھونڈھ رہے ہیں اُسے شیشہ کے نگر میں — شاہی کے سماچار ہیں دنیا کی نظر میں
اِس روپ میں سَت دھرم کا پیغام نہیں ہے — مایا کے چمتکار میں اسلام نہیں ہے
سچائی کی شکتی کا مہا کاج ہے اسلام — سمجھے جو کوئی تو جگتا راج ہے اسلام
اِس دھرم کا دنیا میں سندیسا تھا جب آیا — قابو میں غریبوں کی نہ مایا تھی نہ کایا
کمزور کو آرام نہ باہر تھا نہ گھر میں — اندھیر ہی اندھیر تھا سنسار نگر میں
وہ دن تھے کہ ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی بھلائی — چھائی ہوئی تھی سارے زمانے میں بُرائی
سچائی کا پرچار نہ آدر تھا نہ دکھن — بگڑے ہوئے مدت سے تھے انسان کے لچھن
چمکا جو عرب دیش کی قسمت کا ستارا — کرتار نے آکاش سے اِک نور اُتارا
مکہ میں رسالت کی بچھائی گئی مسند — پیدا ہوئے ہاشم کے گھرانے میں محمدؐ

اِس طرح دُلہن بھی کوئی دیکھی نہ سنورتی
مکھڑے کی پڑی چھوٹ تو جگمگ ہوئی دھرتی

کیا جانیے کس بھیس میں کس رُوپ میں آیا
سنتے ہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں سایا

چھ سال میں ماں باپ جو پرلوک سدھارے
بچپن سے لڑکپن ہوا دادا کے سہارے

جب سر سے اُٹھا آپ کے دادا کا بھی سایا
اِک اور پریمی نے کلیجے سے لگایا

بچوں سے زیادہ یہ بھتیجے پہ فدا تھا
پالا ابو طالبؑ نے جو حضرت کے چچا تھے

چھوٹے ہی سے سن میں تھیں سمجھ بوجھ کی باتیں
کہتے تھے بڑے سوچ میں دن ہوں کہ ہوں راتیں

دیا کی طرح سب کی نگاہوں میں بھلا تھا
یہ چار برس گھر میں حلیمہ کی پلا تھا

سُندر تھا جو ہر کام تو ہر بات تھی بالا
دایہ کو یہ اچرج تھا کہ بچہ ہے نرالا

بے وقت نہ کھایا کبھی، بے وقت نہ سویا
مچلا نہ کبھی دودھ کے کارن نہ وہ رویا

اِس چاند میں آنکھوں نے کوئی کھوٹ نہ پائی
جو من کی صفائی تھی، وہی تن کی صفائی

بھولے سے کبھی اپنی بڑائی نہ جتائی
بیٹوں کو حلیمہ کے سمجھتا رہا بھائی

باتیں نہ گھمنڈی کبھی ہردے میں سمائیں
یوں ساتھ دیا اُن کا کہ بھیڑیں بھی چرائیں

بچوں کی طرح اُس نے کوئی کھیل نہ کھیلا
اُس کے لیے دنیا میں تماشہ تھا نہ میلا

گاہک تھا وہ ہر آن غریبوں کی خوشی کا
سنسار میں دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا

بیتا وہ لڑکپن کا سمے آئی جوانی
انسان کے جیون کی گھڑی سب سے سُہانی

نردوش تھی جو پھول کی چندن کی طرح سے
جو پاک رہی صبح کے دامن کی طرح سے

ستونت تھا ایسا جسے دُشمن نے بھی مانا
صادق اُسے بچپن سے ہی کہتا تھا زمانا

نیکی نے بچایا تھا جوانوں کے چُھروں سے
وہ دور ہی رہتا تھا بُرائی سے بُروں سے

نربل کو بھی سکھ ہو، اِسی اُلجھن میں پڑا تھا
ودھوا سے کیا بیاہ کہ پُن اِس میں بڑا تھا

سرپنچ بنا قوم کا جھگڑا بھی چُکایا
دھرتی کو بڑی سخت لڑائی سے بچایا

اَن جَل کے لیے کرنا ہی پڑتا ہے یہ کنتھا
بیوپار بزرگوں کی طرح اُس کا چلن تھا

اُبھری ہوئی تھی ہاتھ میں ایمان کی ریکھا
بیوپار میں ایسا کوئی دھرمی نہیں دیکھا

کچھ دن میں نئی پیار کی صورت نظر آئی
پیدا ہوا اِک سب سے بڑا اُس کا فدائی

اِک تاروں بھری رات نے آنچل جو سمیٹا
چوتھا ابو طالبؑ کو ملا چاند سا بیٹا

کعبہ میں ہُوا جس کا جنم یہ وہ بَلی ہے
اللہ کے گھر میں ہُوا پیدا کہ علیؑ ہے

گھر اُس کا چلن اُس کا وہی ذات وہی ہے
جو بات محمدؐ کی ہے ہر بات وہی ہے

جنتا کی بھلائی میں بہت رنج سہے ہیں
ہر کام میں اُن دونوں کے دل ایک رہے ہیں

جن باتوں میں تھی کھوٹ بہت اُن سے پرے تھے
بھولے سے نہ کی مورتی پوجا وہ کھرے تھے

دِل جس سے ملے ایسا نہ تھا میل کسی سے
لاکھوں میں محمدؐ کو محبت تھی علیؑ سے

جی لگتا تھا بستی سے الگ شہر سے باہر
استھان بنا رکھا تھا اِک غار کے اندر

جو قوم تھی وہ پاپ کے چکر میں پڑی تھی
انساں ہے کُرستے پہ یہ فکر اس کو بڑی تھی

کیا کشٹھ کی بھرمار ہے اپرادھ کا ریلا
بیٹھا وہ یہی سوچتا رہتا تھا اکیلا

کرتا ہے ہر اک اپنے قبیلے کی بڑائی
بے بات بھی ہوجاتی تھی آپس میں لڑائی

بدلہ کا لگا روگ تو کم ہی نہیں ہوتا
دادا کی جگہ لڑنے کو تیار ہے پوتا

آنند یہودی ہے جو مہہ سود کا برسے
عیسائی ہیں بھٹکے ہوئے عیسیٰ کی ڈگر سے

کچھ لوگ اسے اپنی سمجھتے ہیں جو بیٹی
دھرتی میں دبا دیتے ہیں پیدا ہو جو بیٹی

انسان نے انساں کا بنایا ہے یہ کیا حال
ہے جانوروں سے بھی غلاموں کا بُرا حال

کس اُور ہے سنسار کا بہتا ہوا دھارا
نیکی سے ہوسمبندھ تو مشکل ہے گزارا

کرتے ہی نہیں فرق بُرے اور بھلے میں
اوقات گزرتی ہے شراب اور جوئے میں

کب تک یہی اَنیائے کا بیوپار رہے گا
کب تک یہ اَدھا دُھند سا چار رہے گا

دن رات غریبی ہے امیری کا نوالا
آنکھیں ہیں مگر کوئی نہیں دیکھنے والا

اِک روز اِسی دھیان میں اوڑھے ہوئے چادر
چُپ چاپ وہ لیٹا ہوا تھا غار کے اندر

دنیا کو بدلنے کا چلن سوچ رہا تھا
انسان کی مکتی کے جتن سوچ رہا تھا

جیسے کبھی گرمی میں بڑی پیاس لگی ہو
سامان نہ ہو کوئی، مگر آس لگی ہو

دُہرا ہی رہا تھا یہ کہانی ابھی مَن میں
پیدا ہوا اک بھاؤ نیا من کی لگن میں

جیسے کوئی جاگے ہوئے کو اور جگادے
لو جیسے کوئی پیار کے دیپک کی بڑھا دے